مکاتیبِ مشاہیرِ تحقیق بہ نام محمد حمزہ فاروقی

محمد حمزہ فاروقی*

۱

اسّی کی دہائی میں مشفق خواجہ صاحب نے اپنے ایک مہمان سے متعارف کرایا۔ اکرام چغتائی صاحب کا ظاہر پُر شکوہ تھا اور باطن بھی علمی وجاہت اور السنۂ مشرق و مغرب پر عبور سے جگمگا رہا تھا۔ انھوں نے جرمن زبان بہت ذوق و شوق سے سیکھی تھی۔ بہت جلد ہمارے تعلقات سرسری مراسم سے بڑھ کر گہری دوستی میں تبدیل ہو گئے۔ چغتائی صاحب روشِ عام سے مختلف سفر ناموں اور علمی کاموں سے متاثر ہوئے تھے۔ آپ ان دنوں اُردو سائنس بورڈ سے منسلک تھے، آپ لاہور سے کراچی آئے تو خواجہ صاحب کو شرفِ میزبانی بخشتے، بعد میں گھر پر ٹھہرے لگے۔

ایک دفعہ وہ اپنا مقالہ بہ زبانِ المانوی سنانے لگے تو میں نے عرض کیا کہ میں جرمن ناشناس ہوں، انگریزی اور اردو کے سوا کسی زبان میں مہارت نہیں رکھتا۔ انھوں نے gear بدل کر انگریزی مضمون پڑھنا شروع کیا۔ ان کی انگریزی مبتدیانہ نوعیت کی تھی، اس پر انگریزی معاشرت اور محاورے کا تڑکا نہیں لگا تھا۔

چغتائی صاحب دھن کے پکے اور محنتی انسان تھے۔ انھوں نے مستشرقین کی علمی خدمات جو انھوں نے برصغیر میں انجام دیں اور نوابینِ اودھ کے کتب خانوں پر قابل قدر تحقیق کی تھی اس ضمن میں وہ جرمنی، آسٹریا، انگلستان اور پاکستانی کتب خانوں سے مستفید ہوئے تھے۔ ان کی برسوں کی محنت آخر رنگ لائی اور حکومتِ آسٹریا نے انھیں قومی اعزاز کا مستحق پایا۔

چغتائی صاحب مالی معاملات میں حد درجہ کفایت شعار تھے لیکن گفتگو میں نہایت ''فراخ دل'' تھے۔ ان کی باتیں گراموفون کی سوئی کی مانند کسی مقام پر اٹک جاتی تو وہ اپنے جملوں کو متعدد بار دہراتے تھے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا کہ وہ خدانخواستہ ''ذہنی ہکلاہٹ'' کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔

چغتائی یاروں کے یار تھے اور دوستی نبھانے کی کوشش کرتے، میں نے غلام عباس کے ادیبوں اور شاعروں غیر

* ماہر اقبالیات، سفر نامہ نگار، مزاح نگار، مقیم کراچی

مطبوعہ کے خطوط مرتب کیے اور انھیں تعلیقات و حواشی سے آراستہ کیا تھا۔ منظر عام پر لانے کے لیے ناظر کی تلاش تھی۔ اکرام صاحب نے لاہور میں مجھے ''القمر انٹر پرائز'' کے مالک محمد سعید اللہ صدیقی سے ملوایا اور کتاب کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ ان حضرات کی عنایت سے ''مکاتیب بنام غلام عباس'' ۱۹۹۶ء میں شرمندۂ اشاعت ہوا۔

چغتائی صاحب جب تک اردو سائنس بورڈ میں ملازم رہے ان کی علمی مقالات نسبتاً کم تعداد میں چھپے، لیکن ان کا معیار بہت بلند تھا۔ بورڈ سے مستعفی ہونے کے بعد ادارۂ سنگ میل سے وابستہ ہوگئے۔ شیخ نیاز احمد اور ان کے رفقا نے اکرام چغتائی صاحب کو ''کتاب ساز'' تصور کیا اور دھڑا دھڑ ان سے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھوانے لگے۔ چغتائی نے اسے روزی کمانے کا ذریعہ تصور کیا اور تحقیق کا پہلے جیسا معیار برقرار نہ رکھا۔ وہ طولِ بیانی میں الجھ کر اصل کو موضوع سے بھٹک جاتے۔ اکثر داڑھی سے مونچھیں بھاری ہونے لگتیں۔ متن بہت مختصر لیکن تعلیقات و حواشی عمرو عیار کی زنبیل بن جاتے۔ ان کے مقالات میں معلومات کثرت سے ہوتیں لیکن تجزیہ اور ناقدانہ بصیرت عنقا ہوتی۔ تحقیق ایک صبر آزما کام ہے۔ ہمارے علمی اداروں کے ناظم ان حضرات کو بنایا جاتا تھا جو اپنے حاشیہ نشینوں اور خوشامدیوں کے سوا کسی کو محقق ماننے یا اس کی تصنیف شائع کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ چناں چہ اکرام چغتائی جیسے آزاد منش انسان کی دال علمی اداروں میں گلنی محال تھی۔

چغتائی صاحب جب بیرون ملک سفر پر جاتے تو خطوط کے ذریعے مجھے شریکِ سفر کر لیتے۔ اور یورپی شہروں کے کتب خانوں اور دل کش مقامات کی سیر کراتے تھے۔

(1)

ٹیوبنگن

۲۱ اپریل ۱۹۸۸ء

برادرم فاروقی صاحب، السلام علیکم

بفضلِ تعالیٰ خیریت سے سفر کٹ گیا اور اب میں پچھلے تین روز سے اس شہر میں ہوں۔ یہ شہر جرمنی کا یونی ورسٹی ٹاؤن ہے اور اپنی قدامت اور اعلیٰ تدریسی روایات کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں کی آبادی ایک تہائی حصہ طلبہ پر مشتمل ہے اور اس میں خاصی بڑی تعداد بیرونی ممالک کے طلبہ کی ہے۔ شہر کا محلِ وقوع بھی خوب صورت ہے۔ پہاڑوں کے دامن اور ان کی ڈھلوانوں پر یہ شہر بکھرا پڑا ہے۔ میرا قیام ذرا بلندی پر ہے لیکن نیچے اس شہر کا پرانا حصہ ہے اور وہاں کی عمارتیں پتھروں کی بنی ہوئی، گلیاں اور سڑکیں آدمی کو کئی صدیاں پیچھے لے جاتی

ہیں۔ شام کے بعد باہر نکلیں تو بڑی عمر کا آدمی نظر نہیں آتا۔ ہر طرف نوجوان اپنی ترنگ میں گھومتے پھرتے ہیں اور میری عمر کے لوگ کمروں میں بیٹھے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے ہیں۔

ابھی یہاں خاصی سردی ہے اور سنا ہے کہ مئی کے پہلے عشرے تک ایسے ہی رہے گی۔ گاہے بگاہے بارش بھی ہوتی رہتی ہے۔ میرا ارادہ یہاں اپریل کے اواخر تک رہنے کا ہے۔ پھر میں ہائڈل برگ اور وہاں سے برلین چلا جاؤں گا۔

جہاں بھی ہوں گا آپ سے تعلق رہے گا، کیوں کہ آپ سے اب دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ آپ نے کراچی میں جس طرح میری پذیرائی فرمائی اس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدا حافظ

محمد اکرام چغتائی

(۲)

ہائیڈل برگ۔ قلعہ اور قدیم پُل

۳۰ مئی ۱۹۸۸ء

محترمی فاروقی صاحب۔ السلام علیکم

ہائیڈل برگ میں کچھ دن رہ کر پھر ٹیو بنگن آ گیا ہوں۔ جون کے پہلے ہفتے تک یہیں رہوں گا، اس کے بعد نیورن برگ جاؤں گا۔ وہاں سے میونخ اور پھر مغربی برلن چلا جاؤں گا۔ برلن میں کام زیادہ ہے اس لیے وہاں تین چار ہفتے رکنا پڑے گا۔ جرمنی میں کام ختم کر کے کچھ ہمسایہ ممالک میں بھی جانے کا ارادہ ہے اور پھر لندن میں بھی کچھ دن رکنے کا ارادہ ہے۔ ان ملکوں کی دعوتیں تو ہیں لیکن اس کا انحصار وقت پر ہے۔

ٹیو بنگن خوب صورت شہر ہے اور یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ''سیاہ جنگل''[1] ہے اور وہیں سے Alps کے پہاڑ شروع ہو جاتے ہیں۔ موسم ابھی سرد ہے اور ہم جیسا آدمی گرم کپڑے پہنے بغیر باہر نہیں نکل سکتا لیکن ان دنوں موسم بہت بدلتا ہے۔ کبھی دھوپ، کبھی بادل، کبھی بارش۔ یہاں موسم انتہائی غیر مستحکم ہے، ویسے موسم کے علاوہ یہاں ہر چیز میں استحکام نظر آتا ہے جب کہ ہمارے ہاں موسم کے علاوہ اور کسی چیز میں استحکام دکھائی نہیں دیتا۔ بہ ہر حال یہاں کام کا بھی لطف آ رہا ہے اور قیام کا بھی۔

جب واپسی کا پروگرام بنا تو آپ کو پیشگی اطلاع دوں گا۔ ان شاءاللہ کچھ وقت آپ کے پاس گزار کر آگے چلوں گا۔ خواجہ صاحب کو سلام۔ خدا حافظ

محمد اکرام چغتائی

(۳)

مغربی برلن۔ ارنسٹ ریوٹر پلاتز

۷ا جولائی ۱۹۸۸ء

محترمی فاروقی صاحب السلام علیکم

برلن آئے ہوئے ایک ماہ ہو گیا ہے۔ اس ماہ کے آخر تک یہیں رہوں گا اور پھر ہیمبرگ، بون اور فرینکفرٹ سے ہوتا ہوا سوئٹزرلینڈ چلا جاؤں گا۔ واپسی میں چند روز کے لیے استانبول میں بھی رکنے کا پروگرام بنایا ہے۔

جرمنی میں بڑی بُری طرح پھنسا ہوا ہوں، ایسے ہی جیسے یہ شہر خود مشرقی جرمنی میں پھنسا ہوا ہے۔ سارا دن یہاں کے مرکزی کتب خانے میں گزر جاتا ہے۔ ابھی تک برلن کی سیاحت نہیں کی، اتنا وقت ہی نہیں ملتا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ یہاں ہمارے کام کی اتنی چیزیں پڑی ہوئی ہیں اب میں کوشش کر رہا ہوں کہ ان کو سمیٹ لوں اور ساتھ لیتا چلوں۔ واپسی پر تفصیل سے بات ہو گی کہ یہاں سے کیا کچھ ملا لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ مجھے خود بھی توقع نہیں تھی کہ یہاں سے ایسے نوادرات حاصل ہو جائیں گے کہ جو ہمارے پورے برصغیر میں دست یاب نہیں۔

موسم اب اچھا ہے، سردی زیادہ نہیں۔ دھوپ بھی نکلتی ہے لیکن ان دنوں بارشیں بہت ہو رہی ہیں۔ ہمارے لیے بہ ہر حال ابھی موسم سرما ہے کیوں کہ میں تو گرم کپڑے پہنے بغیر باہر نہیں نکل سکتا۔ مشفق صاحب کو سلام کہہ دیں۔ خدا حافظ

تابع

محمد اکرام چغتائی

(۴)

برلن

۱۹ اگست ۱۹۸۸ء

محترمی حمزہ فاروقی صاحب۔ السلام علیکم

برلن آئے ہوئے تقریباً دو ماہ ہو گئے ہیں۔ بالعموم میں اس شہر میں آ کر پھنس جاتا ہوں۔ یہاں جرمنوں نے ایک ایسی لائبریری بنا دی ہے جہاں سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں اسلامی تہذیب و تمدن کے حوالے سے اتنا کچھ جمع ہے کہ کیا بتاؤں۔ کبھی ادھر آئیں تو اسے ضرور دیکھیے گا۔

چند روز بعد یہاں سے روانگی ہے۔ ہیمبرگ اور بون سے ہوتا ہوا فرینکفرٹ پہنچوں گا۔ واپسی پر ہفتہ عشرہ استانبول میں رکنے کا ارادہ ہے، اسی لیے یہاں سے ترکی ویزالگوالیا ہے۔ آپ کے ڈاکٹر ذوالفقار صاحب سے ملاقات ہو گی اور ان سے خوب باتیں ہوں گی۔ ظاہر ہے میں ان کی باتیں سنوں گا لیکن اپنی بھی ضرور سناؤں گا۔

ان دنوں یہاں موسم گرما پورے جوبن پر ہے۔ دھوپ میں وہ تمازت تو نہیں جو ہمارے ہاں ہوتی ہے، ہمارے لیے تو یہ موسم بہار ہے۔ خواجہ صاحب کو میرا اسلام پہنچا دیجیے۔ واپسی پر کراچی میں آپ سے تفصیلی ملاقات ہو گی۔ ان شاءاللہ۔ خدا حافظ

تابع

محمد اکرام چغتائی

(5)

لندن

۲۹ اگست ۱۹۹۳ء

برادرم حمزہ فاروقی صاحب

السلام علیکم

یہاں آئے ہوئے ڈھائی مہینے ہونے لگے ہیں اور یہ پہلا خط ہے جو آپ کو لکھ رہا ہوں۔ باعثِ تاخیر کچھ تو خرابیِ صحت اور کچھ کام کی زیادتی۔ خرابی تو اب بفضلِ تعالیٰ دور ہو گئی ہے لیکن زیادتی جوں کی توں چل رہی ہے بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہو تا جا رہا ہے۔ ارادہ تو جولائی تک رکنے کا تھا لیکن اہم ترین مواد کی غیر متوقع دریافت نے پاؤں پکڑ رکھے ہیں۔ مجبوراً اپنی حاصل کردہ رخصت میں دو ماہ کی توسیع کرانا پڑی۔ میرا خیال ہے ستمبر کے اواخر یا اکتوبر کے شروع تک اپنے کام کا بیشتر حصہ مکمل کرلوں گا اور پھر واپسی کے لیے رختِ سفر باندھوں گا۔ ان شاءاللہ

اس دفعہ کراچی میں میرا قیام یادگار رہا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی آسانیاں میسر آئیں گی۔ یہ آپ کی محبت اور مثالی تعاون کی بدولت ممکن ہوا۔ یہ سوچ کر شرمندگی سی ہوتی ہے کہ لاہور میں آپ کی اتنی خدمت نہیں کر سکتا اور نہ آپ کو اتنا وقت بھی دے سکتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس ایسے وسائل نہیں جو اللہ نے آپ کو دے رکھے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ادب یا تحقیق آپ کا ذریعۂ معاش نہیں ہے اور آپ تمام تر تفکراتِ فردا سے آزاد ہو کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہ سکتے ہیں۔ خیر! انسانی زندگیوں میں یہ فرق تو ہوتا ہے۔ بہ ہر حال آپ نے کراچی میں مجھے جو آسانیاں فراہم کیں، اس کے لیے میں آپ کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ واپسی میں کراچی میں رکوں گا اور آپ کے ساتھ پھر ملاقات ہو گی۔ ان شاءاللہ۔

آپ نے چلتے ہوئے ذکر کیا تھا کہ جولائی کے ابتدائی عشرے میں آپ لندن آنے کا پروگرام بنا رہے ہیں، میں تو انتظار میں رہا اور گاہے گاہے سلیم الدین قریشی صاحب سے آپ کے بارے میں معلوم کرتا رہتا تھا۔ اس سے قبل انھوں نے بتادیا کہ آپ کے اہل خانہ لندن پہنچ چکے ہیں اور آپ کی آمد بھی متوقع ہے۔ جولائی کے وسط میں انھوں نے اطلاع دی کہ آپ نے پروگرام تبدیل کر لیا ہے اور اب آپ یورپ آنے کے بجائے اپنے ہی ملک کے شمالی علاقوں کی سیاحت کے لیے نکل گئے ہیں۔ اس اطلاع کا تاثر کچھ اچھا نہ رہا کیوں کہ لندن میں آپ سے ملاقات کا یہ پہلا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ چلیں پھر کبھی سہی۔[۲]

ان دنوں میرا سارا وقت انڈیا آفس لائبریری ہی میں گزرتا ہے۔ شروع شروع میں کبھی کبھار برٹش میوزیم اور SOAS بھی چلا جایا کرتا تھا لیکن جب سے نئے مآخذ کا پتا چلا ہے میں یہیں انڈیا آفس ہی میں پھنسا ہوا ہوں۔ قریشی صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ انھوں نے میری بڑی مدد کی ہے۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ لوگوں سے نہیں مل سکا۔ ایک بار ڈیوڈ میتھیوز کو فون کیا تھا پتا چلا کہ وہ ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ سنا ہے شہر میں کوئی صاحب کراچی میں اردو کانفرنس منعقد کر رہے ہیں اور اس میں ڈیوڈ کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔ خالد حسن قادری صاحب ریٹائر ہوگئے ہیں اور اب گھر پر کام کرتے رہتے ہیں، میری ان سے فون پر طویل بات چیت ہوئی ہے۔ ملاقات ابھی نہیں ہوئی ہے۔ شعبۂ تاریخ میں ایک زوار زیدی صاحب ہوا کرتے تھے، وہ بھی اب ریٹائر ہوگئے ہیں ان کی جگہ ایک برطانوی خاتون کا تقرر ہوا ہے۔ یہ صاحب انڈیا آفس لائبریری ہی میں ملے تھے۔ ان کے "علم و دانش" کی بہت سی کہانیاں زبانِ زدِ خاص و عام ہیں۔ کسی نے بتایا کہ یہ صاحب آج کل قائداعظم کے کاغذات پر کام کر رہے ہیں اور اس حوالے سے حکومتِ پاکستان نے انھیں کوئی اعزاز بھی دیا ہے۔

آپ کے کام کیسے چل رہے ہیں؟ افکار و حوادث کی جلد دوم تو اَب آخری مراحل میں ہوگی[۳]۔ انڈیا آفس والے اردو کتابیں بھی خاصی تعداد میں خریدتے ہیں۔ قریشی صاحب کو لکھیں کہ وہ یہاں کے لیے آپ کی کتابیں منگوائیں، چوں کہ یہ کتابیں اپنی معلومات اور نئے مواد کے حوالے سے اہم ہیں اس لیے ان کا یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ آخر میں آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے کراچی میں میرا اتنا خیال رکھا اور مجھے اتنی سہولتیں فراہم کیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

خیر اندیش

محمد اکرام چغتائی

(6)

بون

۱۹ستمبر ۱۹۸۸ء

محترمی فاروقی صاحب۔ السلام علیکم

ہیمبرگ سے چلا اور چند روز قبل بون پہنچا۔ اب جرمن قدرے روانی سے بول لیتا ہوں اس لیے سفر بڑا پُر لطف ہو گیا ہے اور کسی طرح کی پریشانی نہیں ہوتی۔ حالاں کہ انگریزی کے سہارے جرمنی کا سفر بڑا مشکل ہے۔ ابتدا میں میرا خیال نہیں تھا کہ یہاں اتنی دیر رکوں گا لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ یہاں سے نکلنا مشکل ہو گیا ہے۔ بہر حال فرینکفرٹ پہنچ کر روانگی کی تیاری شروع کروں گا۔ جرمنی سے پہلے استانبول جاؤں گا۔ وہاں ہفتہ عشرہ ٹھہروں گا۔ استانبول (میں) ذوالفقار صاحب سے بھی ملاقات ہو گی، کچھ اور دوستوں سے بھی ملوں گا، وہاں سے سیدھا کراچی آؤں گا۔ ان شاءاللہ۔ آپ سے ملتا ہوا آگے کا رُخ کروں گا۔ آج چند گھنٹوں کے لیے اپنے سفارت خانے جانے کا موقع ملا۔ مہینوں کے بعد کچھ اخبارات پڑھے اور ان سے تازہ حالات کا پتا چلا۔

استانبول سے روانگی سے قبل آپ کو اپنے آنے کی اطلاع دوں گا۔۔

تمام احباب کو میرا سلام اور خیریت کی اطلاع دیجیے گا۔

تابع

محمد اکرام چغتائی

(۷)

لندن

۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء

برادرم حمزہ فاروقی

السلام علیکم۔ آپ کا نوازش نامہ بابت ۲۱ ستمبر موصول ہوا۔ آپ نے یہ خط بھجوانے میں جو اہتمام کیا ہے، وہ تو خاصا متاثر کن ہے ؎۔ آپ کی ہمت اور لگن کی داد دینا پڑتی ہے کہ وسائل کی اتنی فراوانی کے باوجود آپ اپنا بیشتر وقت علمی کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ یہ دور ایسا ہے کہ کسی سے مالی منفعت کی توقع نہ ہو تو کوئی اس سے بات کرنا بھی

پسند نہیں کرتا۔ معاشرتی روابط میں یہ طرزِ سلوک نقصان دہ ہے لیکن کیا کیجیے، وقت ہی ایسا آن پڑا ہے۔ پھر بھی آپ جیسے لوگوں کا وجود غنیمت ہے کہ بظاہر ایسے حوصلہ شکن حالات میں بھی اس مدھم سی علمی لَو کو بجھنے نہیں دیتے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس دوران میں وسطِ ایشیا کے مراکزِ علمی کا چکر لگا آئے۔ میرا خیال ہے کہ وہی ایک ایسا کام ہے جو آپ اہل خانہ کو بتائے بغیر کرتے ہیں۔ کبھی اپنے ایسے چھوٹے موٹے سفروں کے تجربات و مشاہدات کو بھی قلم بند کر دیجیے۔ آپ کے سفر ناموں کا ایک علمی رنگ بھی ہے جو اُردو سفر ناموں کی موجودہ کھیپ میں کم ہی نظر آتا ہے۔ میں بھی واپس آئے ہوئے کچھ دیر کے لیے تاشقند رکوں گا، لیکن وقت کی کمی کے باعث یہاں کے آثار وغیرہ کو تفصیل سے نہیں دیکھ پاؤں گا[۵]۔

سلیم الدین قریشی صاحب کو آپ کا سلام اور پیغام دونوں پہنچا دیے ہیں۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ان سے تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ایک دو بار تو ان سے گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں، متعلقہ ریکارڈ کی تلاش میں وہ خاصی مدد کرتے ہیں۔ یہاں سے کسی دستاویز کی فوٹو کاپی حاصل کرنا بہت مشکل ہے اور اگر مل جائے تو وہ بہت مہنگی پڑتی ہے۔ قریشی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے سیکڑوں صفحات کی فوٹو تیار کرا دی اور اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لیا۔ سوچتا ہوں اگر یہ فوٹو کاپی نہ ملتی تو ان دستاویزات کو نقل کرنے میں مجھے ایک ڈیڑھ ماہ مزید صَرف کرنا پڑتا۔ آپ ان کو اپنی تازہ تالیفات ضرور بھجوایے کیوں کہ انڈیا آفس لائبریری میں آپ کی کتابوں کی موجودگی ضروری ہے۔

میرا واپسی کا پروگرام فائنل ہو گیا ہے اور میں تاشقند سے ہوتا ہوا ۱۲۰ اکتوبر کو پاکستانی وقت کے مطابق ۳ بجے سہ پہر کراچی پہنچ جاؤں گا۔ ان شاء اللہ۔ تاشقند سے کراچی بذریعہ ازبکستان ایئر لائن آؤں گا۔ کراچی میں زیادہ دیر کے لیے تو نہیں ٹھہروں گا۔ پھر بھی آپ سے ملاقات ضروری ہے۔ امید ہے آپ تفصیلی بات چیت کے لیے کچھ وقت ضرور مختص کریں گے۔

اگر آپ مناسب سمجھیں تو میری آمد کے حوالے سے خواجہ صاحب سے رابطہ کر لیجیے۔ کم از کم میری خاطر، ممنون رہوں گا۔ باقی باتیں عند الملاقات۔ اجازت دیجیے، اللہ حافظ

مخلص

محمد اکرام چغتائی

(۸)

اُردو سائنس بورڈ۔ ۲۹۹ اَپر مال لاہور

۲۵ نومبر ۱۹۹۳ء

محترمی حمزہ فاروقی صاحب

السلام علیکم۔ قبل ازیں آپ کی خدمت میں اس وقت خط ارسال کیا تھا، جب لندن سے روانگی کا پروگرام طے ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کراچی پہنچتے ہی آپ سے ملاقات ہو گی اور پھر کچھ وقت آپ کے ساتھ گزار کر آگے چل پڑوں گا۔ کراچی پہنچا تو آپ کو نہ پا کر سخت پریشان ہوا، مزید پریشانی یہ ہوئی کہ میرا ایک بیگ گم ہو گیا۔ اس بیگ میں میرے تمام اہم کاغذات تھے اور اس کے ضائع ہونے کا مطلب یہ تھا کہ میرا پورا قیامِ لندن ضائع ہو گیا۔ اس پریشانی کے عالم میں تین چار گھنٹے کراچی ایئرپورٹ پر خراب ہوتا رہا، دو تین بار آپ کو فون کیا لیکن آپ کے دونوں فون نمبر شاید خراب تھے، کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ بہ امرِ مجبوری ایک جاننے والے کے ہاں رات گزاری۔ اس سے اگلے روز گھر کا رُخ کیا، چلنے سے قبل دوبارہ آپ کو فون کیے لیکن جواب ندارد۔ ممکن ہے کہ میں نے لندن سے آپ کو جو خط لکھا ہو وہ تاخیر سے پہنچا ہو۔ بہ ہر حال وجہ کچھ بھی ہو، کراچی میں آپ سے نہ ملنے کا دکھ ہے اور رہے گا[۶]۔

اطلاعاً عرض ہے کہ ماہِ دسمبر کے وسط میں کراچی آنے کا پروگرام بن رہا ہے۔ چند روز کے لیے رکنا ہے اور پھر آپ سے ملتا ہوا آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ کراچی میں قیام کے دوران میں آپ سے بھرپور ملاقاتیں ہوں اور تفصیل سے گفتگو ہو سکے۔ چند روز تک کراچی آنے کا حتمی پروگرام بن جائے گا اور پھر آپ کو اطلاع دوں گا۔ ان شاءاللہ

اجازت چاہتا ہوں۔ اللہ حافظ

خیر اندیش

محمد اکرام چغتائی

(۹)

القمر انٹرپرائزز۔ ۳۹۶، شادمان۔ لاہور

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۵ء

برادرم حمزہ فاروقی صاحب

السلام علیکم۔ آج بہت دنوں کے بعد سعید اللہ صاحب سے ملنے آیا تو معلوم ہوا کہ انھیں ابھی تک پروف واپس نہیں ملے، جو آپ ستمبر کے اوائل میں لاہور سے جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ان تمام صفحات کو پڑھا جا چکا تھا اور اغلاط درست کرا لی گئی تھیں۔ اب آپ جو پروف پڑھیں گے وہ اس اعتبار سے دوسرا ہو گا۔ میرے خیال میں یہ زیادہ دنوں کا کام تو نہیں تھا۔ بہ ہر حال اب پبلشر شدت سے ان پروفوں کا انتظار کر رہا ہے۔ ملتمس ہوں کہ آپ انھیں بغور دیکھ کر جلد بھجوا دیں تاکہ کام کو آگے بڑھایا جاسکے۔ اگر پروفوں کی ترسیل میں مزید وقت درکار ہے تو براہِ مہربانی پبلشر کو چند سطری جواب ضرور تحریر کیجیے گا تاکہ ان کی تشویش دور ہو جائے۔

اس بار لاہور میں آپ سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی، جس کی وجہ میری بے تکی مصروفیات تھی۔ آئندہ اس کی تلافی ضرور ہو جائے گی، اگر آپ آنے سے قبل اپنے پروگرام سے مطلع فرما دیں تو مجھے خاصی سہولت ہو جائے گی۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ حافظ

والسلام

محمد اکرام چغتائی

نوٹ:۔ یہ خط القمر کے ہاں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ اس لیے ان کا لیٹر ہیڈ ہی استعمال کر رہا ہوں۔ معذرت!

2

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو سے آشنائی کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ میں اس وقت ایم اے اُردو کا طالب علم تھا اور نصابی ضرورت کے تحت نقدِ غالب اور احوالِ غالب میرے زیر مطالعہ رہیں۔ یہ دونوں تصانیف آرزو صاحب کی مرتب کردہ تھیں۔ آرزو صاحب دورِ طالب علمی میں علی گڑھ میگزین کے مدیر تھے، انھوں نے ۵۰-۱۹۴۹ء میں میگزین کا غالب نمبر ترتیب دیا تھا اور اس کے لیے برصغیر کے نامور غالب شناسوں کے مضامین حاصل کیے تھے۔ یہ نمبر علمی حلقوں میں اس قدر مقبول ہوا کہ اس شمارے نے نقدِ غالب اور احوالِ غالب کا کتابی روپ دھارا۔ مختار الدین احمد صاحب اس زمانے میں شاعری سے شغف فرماتے تھے، بعد میں انھوں نے شاعری ترک کر دی اور تخلص بھی متروک کیا۔ غالباً انھوں نے شعرا کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ دیکھ کر "علمی پلاننگ" پر عمل کیا تھا۔

مختار صاحب علی گڑھ یونی ورسٹی کے اربابِ اختیار سے لیاقت کا لوہا منوا چکے تھے اور ایم اے اُردو میں طلائی تمغے کے سزاوار ٹھہرے تھے۔ انھوں نے دورانِ تعلیم دو مزید طلائی تمغے حاصل کیے تھے لیکن اقتصادی مجبوری کی بنا

پر ان تمغوں کو سونے کے سکّوں کی مانند فروخت کر دیا تھا۔ ایم اے اُردو بدرجۂ امتیاز پاس کرنے کے بعد شعبۂ اُردو اور شعبۂ عربی کی قسمت آزمائی کی اور ڈاکٹریٹ میں داخلے کی درخواستیں دینے کا ارادہ کیا۔

علی گڑھ یونی ورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر علامہ عبد العزیز المیمنی تھے۔ آپ غیر معمولی حافظے اور عربی زبان و ادب میں قابلِ رشک علمیت، شہرت اور عزت کے سرمایہ دار تھے لیکن تقسیمِ علم میں قسمت اور جذبہ زر اندوزی میں نا قابل رشک شہرت رکھتے تھے۔ حصولِ علم کے لیے انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد رہے، علامہ میمنی جس طالب علم میں جوہر قابل اور عربی زبان و ادب سے بے پناہ لگن کی جھلک پاتے تو اسے سایۂ عاطفت میں لے لیتے۔ اس کے سینے میں علم اور حلق میں بچا ہوا گڑ کا شربت جرعہ بہ جرعہ انڈیلتے۔ یہ حادثہ شاذ ہی رونما ہوتا۔ زر اندوزی کی آرزوئے ناتمام اور تقسیمِ علم میں خست کے باوجود علامہ میمنی جب علمی مجالس سے خطاب فرماتے تو وقت کی گردش تھم جاتی اور عربی زبان و ادب کے مختلف ادوار سامعین کے سامنے لفظی پیکر سے نکل کر زندہ روپ میں نظر آتے، خصوصاً ادبِ جاہلیہ علامہ صاحب کے التفاتِ خاص کا مرکز ہوتا۔ عربی کے سیکڑوں اشعار ان کے مستحضر حافظے سے نکل کر زبان پر رواں ہو جاتے۔ علامہ نے مملوکہ کتب اور زندگی بھر کی جمع پونجی کو عربی مدارس میں تقسیم کرنے کی وصیت کی تھی۔

مختار الدین احمد آرزو جب شعبۂ عربی میں ڈاکٹریٹ کی آرزو لیے علامہ میمنی کے حضور پیش ہوئے تو علامہ نے شعبۂ عربی کے فارم پر اکتفانہ کیا بلکہ شعبۂ اُردو کا فارم بھی طلب کیا۔ مختار صاحب ”غیر متوقع بے عزتی“ خراب ہونے سے ڈر رہے تھے۔ انھوں نے ”حکم عالم مرگ مفاجات“ کے اندیشے کے ساتھ ڈرتے ڈرتے دوسرا فارم پیش کیا۔ علامہ میمنی نے شعبۂ اُردو کا فارم چاک کر کے ردّی کی ٹوکری کی نذر کیا اور شعبۂ عربی میں داخلے کی خواہش کو شرفِ پذیرائی بخشا۔ علامہ میمنی کی زیر نگرانی صرف دو طلبہ سید محمد یوسف اور مختار الدین احمد نے عربی میں ڈاکٹریٹ کی تھی۔

مختار الدین احمد نے پچاس کی دہائی میں علمی مقاصد کے کیمبرج میں کچھ عرصہ قیام کیا اور وہاں کے کتب خانوں اور علمی اداروں سے مستفید ہوئے۔ کیمبرج پاڑا سے فراغت پا کر علی گڑھ واپس آئے تو حالاتِ سفر لکھے اور سہ ماہی نقوش میں زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد کے عنوان سے چھپوائے۔ مختار صاحب نے عنوان کے انتخاب میں کلامِ غالب سے مدد لی تھی۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب عرب ممالک کی مجالسِ علمی میں شرکت کرتے، مقالات پڑھنے اور عربوں کے جذبۂ مہمان نوازی اور علم دوستی سے فیض یاب ہوئے۔ ایسے ہی ایک دورے سے واپسی پر انہوں نے ۱۹۸۲ء میں

کراچی میں چند روزہ قیام کا منصوبہ بنایا۔ ان کی آمد کے تصور سے علی گڑھ یونی ورسٹی کے ”پسماندگان“ یعنی اولڈ بوائز اور ”غیر پسماندگان“ یعنی مشفق خواجہ اور ان کے رفقا بے حد مسرور ہوئے۔ مشفق خواجہ تو ڈاکٹر صاحب کی آمد پر کراچی ایئرپورٹ پر ڈھول تاشوں اور باجوں کے ساتھ استقبال کرنا چاہتے تھے لیکن موسیقی کی ”خروش بے ہنگام“ کو بعض وجوہ نے عملی طور پر ممکن نہ رہنے دیا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ڈھول تاشے بجانے والے زرِ نقد پر یقین رکھتے تھے، ادھار پر انھیں اعتماد نہ تھا۔ خواجہ صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ دوسرے ڈاکٹر مختارالدین احمد بھی اس طرزِ تپاک اور استقبالِ پُر خروش سے خوش نہ تھے، اس لیے خواجہ صاحب کے دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔

کراچی آمد سے قبل ڈاکٹر مختارالدین احمد نے خواجہ صاحب سے بذریعہ خط یہ فرمائش کی تھی کہ کراچی میں ان کی رہائش کا مناسب بندوبست فرما دیں۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب دوستوں سے کہہ کر مہمانوں کو NIPA HOSTEL میں ٹھہرایا کرتے تھے۔ اس طرح ہینگ لگتی نہ پھٹکری کو زحمت دی جاتی اور خواجہ صاحب کا رنگ چوکھا جمتا، چناں چہ ڈاکٹر صاحب کے قیام وطعام کا بندوبست NIPA HOSTEL میں ہوا تھا۔

ڈاکٹر مختارالدین اور مشفق خواجہ کے ساتھ ٹھٹھہ کی سیر کے لیے گئے۔ ان دنوں میرا اسپین کا سفر نامہ آج بھی اس دیس میں مسودے کی صورت میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹھٹھہ کے سفر کے دوران اسے پڑھا اور بعد میں ایک خط میں اپنے تاثرات لکھے جو سفر نامے کے ساتھ چھپے تھے اور اب بطور یادگار درجِ ذیل ہیں۔

سفر نامے میں دو خوبیاں ضرور ہونی چاہئیں، ایک تو یہ کہ قاری کے دل میں سیر وسیاحت کا شوق پیدا کر دے اور اگر پہلے سے موجود ہے تو سفر نامہ آتشِ شوق کو تیز کر دے۔ دوسری یہ کہ منظر کشی ایسی مکمل اور جان دار ہو کہ ہر منظر کی صحیح اور سچی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ حمزہ فاروقی کے زیرِ نظر سفر نامے میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔

اس سفر نامے کا مسودہ میں نے ایک سفر کے دوران پڑھا، میں اس کے مطالعے میں اس قدر کھو گیا کہ باہر کے خوب صورت مناظر اور فطرت کے حُسن اور دل کشی کو بھی وقتی طور پر بھول گیا اور کتاب اس وقت تک ہاتھ سے نہیں چھوڑی جب تک ختم نہ ہوگئی۔

حمزہ کو کیمرے سے تصویریں کھینچنے کا شوق ہے، میں نے ان کی کھینچی ہوئی کچھ تصویریں دیکھی ہیں۔ ان کے دو سفر نامے بھی پڑھے ہیں، وہ مناظر کی تصویر اپنے الفاظ میں اس طرح کھینچتے ہیں کہ پورا منظر نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ جو فن اور صناعی ان کی تصویر کشی میں ہے، وہی ان کی منظر نگاری میں ہے۔

ان کے فقرے برجستہ ہیں، بیان دل نشین اور تحریر شگفتہ، انداز وہی بے تکلفانہ جو ان کی گفتگو کا حصہ ہے۔ حمزہ فاروقی کا یہ سفر نامہ اُردو ادب میں خوش گوار اضافہ ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ دنیا کا سفر کرتے ہیں اور اُردو ادب کو اچھے سفر نامے دیتے ہیں۔

اللہ کرے سلسلۂ شوق نہ ہو بند

ڈاکٹر مختارالدین احمد (علی گڑھ)

آج بھی اس دیس میں سفر نامہ از محمد حمزہ فاروقی۔ مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۹۸۲ء

ڈاکٹر مختارالدین احمد کا قد لمبا اور جسم سڈول تھا۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ اور کشادہ پیشانی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ اور چہرے پر متانت کے ساتھ بشاشت کا امتزاج تھا۔ باتوں میں علمیت کے ساتھ بے ضرر مزاح ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب عربی، فارسی ادبیات کو گھول کر پی چکے، انہوں نے ان زبانوں کے مخطوطات و مطبوعات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ مشفق خواجہ علمی گفتگو سے اپنی اور سامعین کی جان ہلکان کر دیتے، کیوں کہ اُردو اور فارسی مخطوطات کے بارے میں ان کی شناسائی نام رٹنے تک محدود تھی۔ دورانِ سفر ڈاکٹر صاحب نے قدیم عربی مصنف کے متعلق میری غلطی کی اصلاح کی تھی۔

ٹھٹھہ کے سفر میں مکلی کے قبرستان میں پہلا پڑاؤ تھا۔ صدیوں پرانے مقابر اور قبروں کے درمیان گزرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ اس شہرِ خموشاں کی ''آبادی'' موجودہ ٹھٹھہ سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ماضی میں یہ عروس البلاد علم اور تہذیب کا مرکز تھا لیکن دورِ جدید میں یہ شہر جہالت، افلاس اور غلاظت کا منبع تھا۔ مکلی کا قبرستان اپنے مقبروں اور کتبوں سے سندھ کی عظمتِ رفتہ کا امین اور دورِ حاضر کے زوال کا مظہر تھا۔

شام کے وقت ہم شاہ جہانی مسجد میں داخل ہوئے۔ موسم گرم تھا لیکن مسجد میں داخل ہوتے ہی نخلستان کی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ مسجد کے صحن کے اطراف چھوٹے چھوٹے ننانوے گنبد تھے، ان کی خوبی یہ تھی محراب و منبر سے کہی جانے والی اذان اور خطبے کے الفاظ مسجد کے آخری کونے تک پہنچتے تھے۔ صدائیں مسجد کے گنبدوں سے کٹرا کر نمازیوں کے لیے فردوسِ گوش کا متبادل ہوتیں۔ مسجد کی اونچی چھتیں اور دبیز دیواروں میں روشنی اور ہوا کی آمد کے لیے ایسی کھڑکیاں وضع کی گئی تھیں کہ باہر اگر لُو چل رہی ہو تو اندر مسجد میں نمازی لُو سے بچیں اور مسجد قدرتی روشنی سے جگمگاتی رہے۔

مئی ۱۹۸۳ء میں لاہور جانا ہوا تو اورینٹل کالج کا پھیرا لازم تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کالج کے پرنسپل تھے اور ان کے کمرے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار موجود تھے۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ ڈاکٹر مختارالدین احمد کراچی سے آنے والے

تھے اور لاہور میں وہ اورینٹل کالج کے مہمان بننے والے تھے، ان کے قیام اور طعام کا انتظام پنجاب یونی ورسٹی کے مہمان خانے میں تجویز کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ذوالفقار انھیں ایئرپورٹ سے مہمان خانے تک پہنچانے پر مامور تھے لیکن کار سے محروم تھے۔ میں اس وقت ''صاحبِ کار'' تھا اس لیے ڈاکٹر وحید قریشی نے مجھے کارآمد سمجھتے ہوئے استدعا کی کہ ڈاکٹر ذوالفقار کا ساتھ نبھاؤں۔

دوپہر کے وقت ایئرپورٹ پہنچے تو پتا چلا کہ پی آئی اے کے طیارے نے سبک رفتاری کی بجائے سست روی اختیار کی تھی، انتظار کی گھڑیاں ہم نے من پسند موضوعات میں ڈوب کر بِتائیں اور ''سراغِ زندگی پانے'' کی سعی لاحاصل کی۔ خاصی دیر بعد ڈاکٹر مختارالدین احمد ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر تشریف لائے، انھیں ''ٹھکانے لگاکر'' یعنی منزل تک پہنچا کر ہم شانتی پاسکے۔

ڈاکٹر مختارالدین اسّی کی دہائی میں دومرتبہ کراچی تشریف لائے۔ ایک دفعہ وہ بیگم ناظمہ کے ساتھ آئے تھے۔ اس مرتبہ مجھے ان کے ساتھ زیادہ دیر تک مستفید ہونے کا موقع ملا۔ وہ میرے گھر آئے اور کچھ وقت خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ بسر کیا، ڈاکٹر صاحب کے اخلاق کو دیکھ کر اور باتیں سُن کر ان کی خدمت طبیعت پر گراں نہ گزرتی تھی۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ جب وہ علی گڑھ یونی ورسٹی کیمپس میں اپنا مکان بنوا رہے تھے تو تعمیر کی نگرانی ناظمہ صاحبہ کے ذمہ تھی اور ڈاکٹر صاحب حسبِ معمول علمی کاموں میں مصروف رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے صوبے بہار کی تہذیب اور تمدنی روایات سے بے حد لگاؤ تھا۔ معتقدین کے ہجوم سے فرصت پاتے تو ڈاکٹر صاحب بہاری احباب سے ملتے۔ ایک دن انھوں نے بہاری اصحاب سے ملنے کے لیے وقف کیا، میں ان کے ساتھ سیّد مثنیٰ ندوی اور ڈاکٹر محمد سلیم سابق صدر شعبۂ اسلامی تاریخ سے ملنے گیا۔ ندوی صاحب بہت محبت سے ملے، اس وقت ان کے چہرے پر سفید داڑھی سجی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر مختارالدین احمد کے اعلیٰ اخلاق، علمیت اور وضع داری دل پر اَن مٹ نقش چھوڑ جاتے تھے۔ انھیں مطالعہ کا بے حد شوق تھا، وہ پاکستان کے دور افتادہ مقامات سے کتابیں منگواتے تھے۔ تحقیق کے رسیا تھے اور عربی، فارسی اور اُردو ادبیات پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ دینی علوم سے گہری واقفیت کے باوجود فرقہ وارانہ مباحث سے گریز کرتے تھے، ان کی شخصیت علی گڑھ کی تہذیبی روایات اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔

ان کے مکاتیب سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے شعوری طور پر غالب کے اسلوب کی پیروی کی تھی۔ مکالماتی انداز اپنایا تھا اور سلیس زبان اختیار کی تھی۔ جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے، خطوط سے پُرخلوص جذبات اور دوست داری کی روایت جھلکتی تھی۔

(۱)

باسمہ

خندق ایجنسی پالاس   پروفیسر مختار الدین احمد
علی گڑھ۔۱۷اپریل ۲۰۰۶ء   ۲۸۶/۴ناظمہ منزل
محبی حمزہ فاروقی صاحب، السلام علیکم   امیر نشان روڈ۔دودھ پور
علی گڑھ (یوپی) انڈیا

عرصے سے آپ کی خیر و عافیت نہ معلوم ہو سکی۔ افسوس ہے کہ میں خیریت جوئی کا کوئی خط آپ کو نہ لکھ سکا۔ خدا رحمت کے پھول برسائے مشفق خواجہ مرحوم پر کہ وہ دوستوں کا حال چال لکھتے رہتے تھے، اب کراچی میں کسے فرصت!

میرے ایک پرانے دوست اور ہم سبق صبیح الدین احمد بلگرامی علی گڑھ آئے ہوئے تھے، آج واپس جا رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ان سے معلوم ہوا کہ وہ ڈیفنس کالونی کراچی میں رہتے ہیں۔ اس نام سے آپ، آپ کا مکان، آپ کی میزبانی اور آپ کی عنایتیں یاد آ گئیں۔ میرے خطوط اور کتابیں لے جانے پر بہ خوشی تیار ہو گئے اس لیے یہ خط اور کتابیں ان کی معرفت بھیج رہا ہوں۔ رسید سے مطلع فرمایے گا[۸]۔

کیا لکھوں مشفق خواجہ صاحب کی وفات کا کیسا صدمہ ہے، مجھ سے جو ان کے تعلقات تھے وہ آپ کو معلوم ہیں۔ آج کل ان کے خطوط مرتب کر رہا ہوں۔

آپ کی کتابیں جو سابق میں چھپی ہیں وہ بیش تر میرے پاس موجود ہیں۔ اس طرف یہاں پان سات سال میں جو کچھ چھپا ہے اس سے واقف نہیں۔ ابھی ایک کتاب کا ذکر چند ماہ پہلے پڑھا تھا، یقین ہے کہ آپ کے اسفار اور سفر ناموں کا سلسلہ جاری ہو گا۔

خط لکھیے اور اپنے کوائف اور ادبی سرگرمیوں کے حال سے مطلع کیجیے۔ والسلام

خیر طلب

مختارالدین احمد

(۲)

باسمہ

خندق ایجنسی پالاس

علی گڑھ۔ ۳۰مئی ۲۰۰۶ء

محبی محمد حمزہ صاحب۔ السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۲۹ اپریل ابھی تھوڑی دیر پہلے ملا۔ میں ایک دوست کو لاہور خط بھیج رہا تھا، خیال کیا چند سطریں آپ کو آپ کے خط کی رسید میں فوراً لکھ کر لفافے میں ڈال دوں، اس لیے بھی کہ دو روز قبل جو خط آپ نے مجھے لکھا ہے وہ ابھی نہیں ملا، کہیں راہ میں شاید رہ گیا۔ دو ایک دن میں آجائے گا۔

پہلی بات یہ کہ آپ مجھے براہِ کرم "مخدومی" نہ لکھیں، آپ سے میں نے ہمیشہ دوستانہ تعلق رکھا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس اطلاع سے خوشی ہوئی کہ مرسلہ کتابیں اور کتابچے محبِ گرامی ڈاکٹر صبیح الدین احمد بلگرامی کے ذریعے آپ کو مل گئے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے زحمت اٹھا کر آپ کا نیا پتا معلوم چلایا اور مطبوعات آپ تک پہنچائیں۔

نظیر صدیقی مرحوم کے خطوط اور ان کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہی چند ماہ پہلے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے مجھے لکھا تھا لیکن وہ دوست بہت اچھے تھے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے[۹]۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے جو خطوط آپ کو ملے ہیں وہ بہت قیمتی ہیں۔ انھیں اپنے ح 1 واشی کے ساتھ ضرور شائع کیجیے۔ مشفق خواجہ صاحب اور مولانا مہر کے خطوط ممکن ہو تو پہلے کسی رسالے میں شائع کیجیے، پھر کتابی شکل میں لے آیے۔ سید صاحبؒ کے خطوط کی اشاعت کے بارے میں تو کچھ نہیں کر سکتا لیکن آپ چاہیں تو میں اس کی طباعت کا انتظام کسی مطبع سے کرا سکتا ہوں۔ اخراجات پاکستان سے یہاں بہت کم ہوں گے، یہ میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں۔ خواجہ صاحب، مہر صاحب اور سید صاحب کے خطوط کی تعداد لکھیے گا[۱۰]۔

آپ کے پہلے خط اور آپ کی کتابوں کا انتظار ہے۔ امید ہے آپ بہ خیر وعافیت ہوں گے۔ والسلام

مخلص

مختار الدین احمد

(۳)

باسمہ

علی گڑھ۔ ۱۵جون ۲۰۰۶ء

مجی حمزہ فاروقی صاحب۔ السلام علیکم

کرم نامہ مورخہ ۲۲ مئی مجھے ۲۷ کو مل گیا تھا اور باتوں کے علاوہ آپ نے لکھا تھا کہ پچھلے ماہ آپ نے اپنی تین کتابیں بھیجی ہیں، وہ اس تاریخ تک نہیں پہنچی تھیں۔ خیال ہوا کہ چند روز اور انتظار کرلوں۔ پھر آپ کو خط کا جواب بھی دے دوں گا اور کتابوں کی رسید بھی بھیج دوں گا۔ آج ۱۴جون کی تاریخ آگئی اور کتابیں نہیں پہنچیں تو خیال ہوا کہ آپ کو اطلاع دے دوں اور خط کا جواب بھی لکھ دوں کہ آپ انتظار میں ہوں گے۔ آج کی ڈاک دیکھ کر یہ خط لکھ رہا ہوں۔

اب یقین ہو چلا ہے کہ کتابوں کا پیکٹ گم ہوا۔ اب آپ اپنے علاقے کے ڈاک گھر کو اس کی شکایت لکھ بھیجیں اور رجسٹری کا نمبر اور تاریخ انھیں لکھیں لیکن آج کل کے جو حالات ہیں ان میں اس کی توقع کم رکھیں کہ گم شدہ پیکٹ مجھے مل جائے گا یا آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔

عام طور پر خطوط یا کتابوں کے پیکٹ دس دنوں میں معمولی ڈاک سے یعنی سرفیس میل یا سی میل سے آجاتے ہیں۔ ہوائی ڈاک ذرا محفوظ ہے لیکن وہ بھی پہنچنے میں اتنے ہی دن لیتا ہے۔ خط کبھی کبھی ایک دو دن پہلے پہنچ جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ خط جو کل ۱۵جون کو روانہ ہوگا، آپ کو ۲۵جون تک مل جائے گا، ایک آدھ دن پہلے بھی مل سکتا ہے۔

آج ہی تحسین فراقی صاحب اور ضیا الحسن صاحب نے ارمغانِ سید عبداللہ (اورینٹل کالج لاہور) کے کچھ نسخے اور دوسری کتابیں میرے لیے، کچھ اور اصحاب کے لیے اور لائبریری کے لیے بھیجے ہیں۔ یہ دس دن میں پہنچ

گئے ہیں۔ یہ کتابیں Sea Mail سے رجسٹرڈ بک پوسٹ بھیجے۔ پارسل سے نہ بھیجیے، اس پر اخراجات زیادہ دینے ہوتے ہیں اور بند پارسل ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی بعض دفاتر میں رکتے ہوئے آتے ہیں، اس میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ کبھی دیکھ بھال میں کتابیں اِدھر اُدھر بھی ہو جاتی ہیں۔ بہ ہر حال اس پارسل کو تو اب گم شدہ سمجھ لیجیے اور تینوں کتابیں ازراہِ محبت رجسٹرڈ بک پوسٹ کے ذریعے دوبارہ بھیج دیجیے۔ آئندہ بھی کتابیں اسی طرح بھیجیے۔

مشفق خواجہ مرحوم کے جو خطوط آپ نے مخزن میں شائع کرائے تھے وہ میری نظر سے گزرے تھے۔ آپ نے سلیقے سے مرتب کیے تھے، اب مکالمہ (جون) میں انھیں پڑھوں گا اور دوسروں کو پڑھواؤں گا، اس بہانے مکالمہ کی بھی زیارت ہو جائے گی۔ مبین مرزا صاحب کو کہیں کہ وہ میرے پاس بھیجتے رہیں، میں ان کے لیے بہ شرطِ فرصت کچھ لکھوں گا۔ یہ خواجہ صاحب کے دوستوں میں ہیں، اگرچہ مجھے ان سے نیاز حاصل نہیں۔ مہر صاحب کے خطوط علمی و ادبی ہوتے ہیں وہ صحیح چھپنے چاہییں۔ آپ ایسی جگہ چھپوائیں جہاں پر پروفوں کی آپ خود تصحیح کر سکیں۔ آپ روشنائی یا مکالمہ میں چھپوایے۔ خواجہ صاحب مرحوم زندہ ہوتے تو غالب میں باآسانی چھپوا دیتے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے پوچھیے (تو) مخزن میں بھی چھپ سکتا ہے۔

(ڈاکٹر) معین الدین عقیل اور خالد جامعی دونوں شعبۂ تصنیف و تالیف کراچی یونی ورسٹی میں بہت مفید کام کر رہے تھے، ان کی وہاں سے علاحدگی افسوس ناک ہے۔ تبدیلی کی وجہ کیا ہوئی؟ اب کون صاحب اس کے نگراں مقرر ہوئے ہیں؟ کیا (ڈاکٹر) ظفر اقبال صاحب کا اس ادارے سے کچھ تعلق ہے؟ خواجہ صاحب کے والد مرحوم کی ڈائری آپ آسانی سے بجھوا سکیں تو بجھوا دیں"۔

میں نے اپنے اور بعض دوسرے اصحاب کے نام مولانا مہر کے خطوط عرصہ ہوا شائع کیے ہیں۔ نظرِ ثانی کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ کوئی ناشر بھی نظر میں نہیں اس لیے دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہوں[۱۲]۔

ادارۂ یادگارِ غالب کا نگران اب کون مقرر ہوا؟[۱۳] خواجہ صاحب مرحوم کی کئی کتابیں وہاں زیرِ طبع تھیں۔ آپ نے قومی زبان (فروری) میں خواجہ صاحب کے خطوط پر اقتباسات دیکھے ہوں گے۔ اس کی ایک قسط فنون لاہور میں پچھلے ماہ چھپی ہے۔ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزری ورنہ آپ اپنے خط میں اس کا ذکر ضرور کرتے۔

امید ہے آپ بہ خیر و عافیت ہوں گے۔ کراچی میں ملاقات کی توقع بہت کم ہے، نصف ملاقات ہی سہی۔

والسلام

خیر طلب

مختار الدین احمد

(۴)

باسمہ

علی گڑھ

۱۴ستمبر ۲۰۰۶ء

محبی حمزہ فاروقی صاحب۔ السلام علیکم

ابھی آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۷ ستمبر اور آپ کی دو کتابیں قیدِ مقام سے گزر اور یادوں کے دیے بہ حفاظت تمام صرف سات دنوں میں موصول ہو گئیں۔ یہ بھی ڈاک گھروں کا کمال ہے، کبھی کبھی خطوط اور کتابیں مہینوں کے بعد آتی ہیں اور کبھی اس قدر جلد۔ آپ کے ہاں ڈاک کے اخراجات تو بہت بڑھ گئے ہیں۔ ۳۶۰۰ روپے کی کتابوں پر ۳۲۹ محصول ڈاک تو بہت ہے، اب تو کتابوں کی فرمائش کرتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے۔

ہاں مکاتیبِ غلام عباس اب نہ بھیجیے گا"[۱۴]۔ آپ کا مرسلہ پارسل تو گم ہو گیا تھا چند دن پہلے اپنے کتب خانے کی فہرست دیکھ رہا تھا تو ۱۰۴۲ نمبر پر یہ کتاب نظر پڑی، میں نے سمجھا شاید مشفق خواجہ صاحب نے بھیجی ہو، یہ کتاب نکلوا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ رفاقت علی شاہد صاحب نے یکم دسمبر ۲۰۰۴ء کو تحفتاً ارسال کی تھی، اسے پا کر خوشی ہوئی۔ اب آپ کی تصانیف میں افکار و حوادث کے سوا سب میرے کتب خانے میں بحمدہ موجود ہیں۔

ابھی یہ پارسل پہنچا تو رسید لکھنے سے پہلے آپ کے اور معین الدین عقیل صاحب کے دیباچے اور شاہ حسن عطا مرحوم پر آپ کا لکھا ہوا خاکہ پڑھ لیا۔ بہت کامیاب خاکہ آپ نے ان کا لکھا ہے، خدا آپ کو خوش رکھے۔ میرے بہت اچھے ساتھی اور بہت اچھے دوست تھے، خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی تربت ٹھنڈی رکھے۔[۱۵]

اب نمازِ ظہر اور لنچ کا وقت ہو گیا، آپ کی کتابیں آج رات کو بستر پر لیٹ کر ہیڈ لیمپ کی روشنی میں اطمینان سے پڑھوں گا۔ ہاں حریرِ سنگ میری نظر سے نہیں گزری، اگرچہ ان کا کلام ان سے سننے کا بہت اتفاق ہوا، کسی پنواڑی کے ہاں اب اس کا کوئی نسخہ کیا ملے گا۔ چھوٹا سا مجموعہ ہو گا زیروکس کرا کے بھجوا دیجیے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل کو بھی اسی دن خط لکھا تھا جس دن آپ کو لکھا تھا۔ دو مقصد تھے ایک تو یہ کہ کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی مطبوعات اور خواجہ صاحب کی مرتب کردہ ان کے والد کی ڈائری منگوانی تھی۔

دوسرا اہم کام جامعہ کراچی کے رجسٹرار یا کنٹرولر آف ایگزامینیشن کو متوجہ کرنا تھا کہ تین چار پی ایچ ڈی کے مقالے جانچ کر بل سمیت رپورٹ بھیج چکا ہوں لیکن عرصہ گزرنے پر بھی کسی کے معاوضے کا ڈرافٹ نہیں آیا۔

رجسٹرار آفس خط کا جواب تک نہیں دیتا لیکن رپورٹ منگوانی ہوتی ہے تو خط بھی آتے ہیں اور پھر تقاضے نامے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی صاحب کے فون بھی آجاتے ہیں، رپورٹ پہنچ گئی بس انھیں اطمینان ہو گیا۔ معاوضہ کیا بھیجتے، خط کا جواب بھی نہیں بھیجتے۔

آپ تو دوسری دنیا کے آدمی ہیں، عقیل صاحب کو ان امور کا خاصا تجربہ ہو گا۔ انھیں فون کیجیے کہ جلد کچھ کریں۔ معاوضہ ڈالر میں بذریعہ ڈرافٹ بھجوائیں، سارے مقالوں کا معاوضہ ایک ساتھ ڈرافٹ کی شکل میں بنوا دیں یا جلد بھیجیں لیکن کچھ کریں ضرور۔ بہتر ہو تو یہ سطریں ٹیلی فون پر سنا دیں، آخری مقالے کی رپورٹ بھیجے ہوئے بھی کئی مہینے ہو گئے۔ یہ ڈاکٹر ظفر اقبال کی ایک خاتون شاگرد کا مقالہ سعادت یار خاں رنگین پر تھا۔[۱۶]

آپ کی کتابوں کے حسنِ طباعت نے بھی بہت متاثر کیا، اشاعت کا سلسلہ جاری رکھیے۔ امید ہے آپ بہ خیر ہوں گے۔ والسلام

مختار الدین احمد

(۵)

باسمہ

علی گڑھ۔ ۵ اگست ۲۰۰۸ء

محبی حمزہ فاروقی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کے دونوں خطوط ۲۲ مئی اور ۲۶ جون کے خطوط کے جواب بہت پہلے دے چکا ہوں۔ گم شدہ پارسل کتابوں کا اب بھی نہیں آیا۔ آپ دوبارہ زحمت فرمایے اپنی کتابیں تو بھیج ہی دیجیے اور مکاتیب بنام غلام عباس کی تلاش میں رہیے۔

والسلام

مختار الدین احمد

حوالہ جات:

ا۔ اسے "سیاہ جنگل" یا Blacke Forest کا نام اس لیے دیا گیا کہ یہاں بلند و بالا درختوں کا سایہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ سورج کی شعاعیں زمین تک نہیں پہنچ پاتیں۔ یہ جنگل جنوبی جرمنی کی ریاست باویریا سے سوئٹزرلینڈ کی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔

۲۔ میں نے انگلستان جانے کا ارادہ ترک کیا اور ازبکستان کی سیر کو ترجیح دی۔ میں ۱۱ جولائی ۱۹۹۳ء سے ۲۱ ر جولائی ۱۹۹۳ء تک تاشقند، سمر قند اور بخارا کی سیاحت میں مصروف رہا تھا۔

۳۔ افکار و حوادث۔ جلد دوم۔ اپریل ۱۹۹۹ء میں "مغربی پاکستان اردو اکادمی" لاہور نے شائع کی تھی۔

۴۔ میں نے یہ خط TCS سروس سے بھجوایا تھا۔

۵۔ سفر ازبکستان کے تاثرات پہلی مرتبہ ازبکوں کے دیس میں ماہنامہ مخزن۔ شمارہ نمبر ۸، ۲۰۰۴ء۔ ص ص: ۳۹۔ ۲۰ میں چھپا تھا۔
دوسری مرتبہ۔ انتخابِ مخزن۔ دورِ جدید (۲۰۰۱ء۔ ۲۰۱۳ء) مرتب ڈاکٹر انور سدید۔ مجلس ترقیِ ادب۔ لاہور۔ ص ص ۳۴۳۔ ۳۶۴۔ مارچ ۲۰۱۶ء
قیدِ مقام سے گزر۔ مصنف محمد حمزہ فاروقی۔ ازبکوں کے دیس میں۔ ص ص: ۱۳۳۔ ۸۹۔ اکادمی بازیافت۔ کراچی۔ اپریل ۲۰۰۵ء

۶۔ اکرام صاحب کی تکلیف کا مجھے دکھ تھا لیکن اس زمانے میں میں بیوی اور بچوں کے ساتھ لاہور میں تھا۔

۷۔ پروف ریڈنگ کے لیے مسودے کی کئی خواندگیاں درکار تھیں اس لیے پروف خوانی میں دیر ہوئی تھی۔ اکرام چغتائی صاحب نے مجھے محمد سعید اللہ صدیق صاحب سے متعارف کرایا تھا اور مکاتیب بنام غلام عباس "مکتبہ القمر انٹر پرائزز" لاہور نے ۱۹۹۶ء میں چھاپی تھی۔

۸۔ ڈاکٹر صبیح الدین احمد بلگرامی نے ۲۲ مئی ۲۰۰۶ء کا خط بہ نام حمزہ فاروقی میں لکھا تھا۔ آرزو صاحب نے میرے نام خط میں ملفوفہ کاغذات آپ کے لیے ارسال فرمائے ہیں۔ خط میں بلگرامی صاحب لکھتے ہیں کہ: قیدِ مقام سے گزر پڑھی بہت لطف آیا۔ آپ کا طرزِ تحریر ماشاء اللہ بہت شگفتہ ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آمین۔
"آپ نے روم کے نوسر بازوں کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے شاگردِ رشید مصری نوسر باز اب رومیوں سے بہت آگے ہیں۔ جو "فن" انھوں نے رومیوں سے دو ہزار سال قبل سیکھا تھا اس میں سیکڑوں سال کے تجربے کی روشنی میں بہت سی جدتیں کرلی ہیں اور ان کے ہر نوسر باز کے کچھ اپنے خاندانی راز بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین
میں نے یورپ کے چند بڑے شہر مثلاً لندن، پیرس، روم، ایمسٹرڈیم، ایتھنز وغیرہ طالب علمی کے زمانے میں ۱۹۵۵ء۔ ۱۹۶۰ء پیدل چل کر دیکھے تھے۔ تفصیلات بھی ذہن سے محو ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد بارہا ان اور دوسرے شہروں اور دوسرے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن چوں کہ میں ماہر ارضیات ہوں اس لیے تقریباً تمام وقت جنگلوں اور پہاڑوں میں گزارنا پڑا۔ وہ بھی ایک منفرد تجربہ تھا لیکن لکھنے کی صلاحیت نہ ہونے کے علاوہ اس کی لگن بھی نہ تھی اس لیے ان شہروں اور شہریوں کو سرسری نظر سے دیکھا"۔

۹۔ نظیر صدیقی اور مشفق خواجہ کے خطوط "مجاورِ مشفق" عبدالرحمن طارق نے لاہور سے شائع کرائے تھے۔ میں نے طارق صاحب سے کہا تھا کہ ان خطوط کی اشاعت سے نہ ادبی اور علمی خدمت ہو گی اور نہ مرحومین کا بھلا ہو گا۔

۱۰۔ ملاحظہ فرمایے: بنیاد۔ جلد ۵، ۲۰۱۴ء۔ لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز۔ لاہور پاکستان۔ مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کا اشتراکِ علمی۔ ص: ۲۱۱۔ ۲۴۸، مکاتیب سید سلیمان ندوی۔ ص: ۲۴۹۔ ۳۰۴
بزمِ احبابِ ندوہ۔ مصنف محمد حمزہ فاروقی۔ اکادمی بازیافت۔ کراچی جولائی ۲۰۱۸ء
مخزن۔ شمارہ نمبر ۱۰۔ جلد ۵، شمارہ ۲۔ مکتوباتِ مشفق خواجہ۔ ص ۳۵۔ ۶۲
مکالمہ۔ اکادمی بازیافت کراچی۔ شمارہ نمبر ۱۵، جولائی ۲۰۰۵ء۔ جون ۲۰۰۶ء۔
مشفق خواجہ از: محمد حمزہ فاروقی۔ ص: ۲۲۱۔ ۲۲۸
خط بہ نام محمد حمزہ فاروقی۔ ص: ۴۱۶۔ ۴۳۸

۱۱۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ۲۰۰۶ء میں یونی ورسٹی سے ریٹائر ہو گئے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی کے بعد ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

۱۲۔ مولانا مہر کے خطوط بہ نام ڈاکٹر مختار الدین احمد مندرجہ ذیل رسائل میں چھپے تھے:
سہ ماہی نقوش مکاتیب نمبر۔ جلد سوم۔ شمارہ ۱۰۹۔ اپریل مئی ۱۹۶۸ء
نقوش۔ خطوط نمبر۔ شمارہ: ۶۶۔ ۶۵، نومبر ۱۹۵۷ء
تحقیق۔ مجلہ شعبۂ اردو۔ جامعہ سندھ۔ شمارہ نمبر ۱۳۔ ۱۲

۱۳۔ محترمہ فاطمہ ثریا بجیا نگران مقرر ہوئی تھیں۔

۱۴۔ مکاتیب بہ نام غلام عباس۔ مرتبہ محمد حمزہ فاروقی۔ القمر انٹرپرائزز، لاہور۔ ۱۹۹۶ء

۱۵۔ یہ خاکہ ہم نفسانِ خوش گزراں میں بھی چھپا تھا۔
ہم نفسانِ خوش گزراں۔ مصنف محمد حمزہ فاروقی۔ مکتبۂ بازیافت، کراچی۔ جون ۲۰۱۵ء

۱۶۔ ڈاکٹر ظفر اقبال۔ سابق صدر شعبۂ اردو۔ جامعہ کراچی۔

Abstract

The unpublished letters of known researchers Mukhtaruddin Ahmed Arzoo and Muhammed Ikram Chaghatai addressed to Muhammad Hamza Farooqui. These letters have many things to shed light on the literary interests of the senders and the recipient of the letters. Apart from these, some social aspects go paralleled with them such as expenses of surface mail, sea mail and air mail. The letters of both sides have little hope to recover those letters lost. No office would facilitate in this regard. The expenses of publishing have always been more economical in India than in Pakistan. Mr Arzoo has expressed his concerns over the careless attitude of a university for whom he assessed Phd dissertations as a foreign referee as it neither sent money for the assessment nor bothered to reply to a letter or phone call from the assessor. A Lahore-based Mr Chaghatai travelled Europe for the first time in the early eighties. His nine letters have something to say about his brief stay in Karachi for imparting his journey to Europe or vice versa. He used to stay in Karachi at the residence of noted satirist Mushfiq Khwaja. These letters of Mr Chaghatai are not only a clear reflection of his interest in the scenic beauty of Europe but also, he provoked the recipient to visit these beautiful places of Europe which MrFarooqui travelled later.

Keywords: Europe, unpublished letters, scenic beauty, known researchers